

مُسترد

معین نظامی

بسم الله الرحمن الرحیم

۲ |مسترد|

مُسترد

معین نظامی

۸۹۱.۴۳۹۱

م ع ی ن، معین نظامی (پ: یکم فروری ۱۹۶۵ء)

مستزاد/معین نظامی

نڑالی: مخدومہ امیر جان لائبریری، مارچ ۲۰۲۶ء، اوّل، ۱۲۸صفحات

۱-شاعری-اردو ۲-معین نظامی

۳-غزلیات ۴-پنجاب-لاہور-معظم آباد

سلسلۂ اشاعت (پینتیس)

MUSTARADI -MOEEN NIZAMI,

NARALI: MAKHDUMA AMIR-JAN LIBRARY,MARCH2026,PP128,

SERIES OF PUBLICATION(35)

سرورق: سائل نظامی

خطاطی سرورق: صفدر حسین راجا عارف القلم (گوجر خان)

نقشِ اوّل: مارچ ۲۰۲۶ء

ناشر: مخدومہ امیر جان لائبریری، نڑالی/گوجر خان

بڑے بیٹے

طٰہٰ احسن

اور ان کے بیٹے

محمد حسیب

کے نام

فہرست

پیشانی

شاعری تمھاری لاتعلق سی آنکھوں سے پھوٹتی ہے جو بعض اوقات انتہائی اجنبی ہوتی ہیں. بہت قدیم اجنبی.

شاعری تمھاری آنکھوں ہی میں ہنستی، کھیلتی، جھولے جھولتی خوش رہتی ہے. وہیں رہنا چاہتی ہے. اسے طرح طرح کے منظروں کے ساتھ ساتھ انواع واقسام کے برگر، نت نئی آئس کریم، کھوئے کی یخ بستہ قلفیاں اور کھولتی ہوئی کالی کافی جو ملتی رہتی ہے. کبھی کبھی کولڈ کافی بھی. بھاپ اڑاتے دال چاول بھی.

ویسے بھی قدرتی ٹھکانے اور موروثی جھروکے عام طور پر چھوڑے بھی نہیں جاسکتے. پُرامن، پُرسکون اور پُرفضا گھونسلے چھوڑنے بھی نہیں چاہئیں. بندہ کہیں کا بھی نہیں رہتا. اچھا خاصا کہیں رہ کر بھی بس یہی محسوس کرتا رہتا ہے کہ کہیں بھی نہیں رہ رہا، کہیں رہ ہی نہیں سکتا.

شورانگیز غزلیں اور مسرت واذیت آمیز نظمیں تمھاری آنکھوں سے باہر نکلتی ہی نہیں. ڈسٹ الرجی؟ سموگ کی چبھن؟ صف بہ صف ایستادہ گہری اور سرمگیں پلکیں بھی تو اس تغزل کو باہر نہیں جھلکنے چھلکنے دیتیں. پلکیں نہ ہوئیں، بے لحاظ چوب دار ہوئے. چلو، وہ خوش ہولیں، ہماری خیر ہے. ان کا حق، حکم اور ترجیح سب پر فائق ہے.

مجھے اب خدانخواستہ کسی ناگزیر مشاعرے میں ہنگامی شرکت کرنی پڑ گئی تو آرام سے سیدھا تمھاری آنکھوں کے سواد و بیاض سے چند چیزیں چن کر عاریتاً لے جایا کروں گا. پرنٹ کیسے لوں گا؟ عکس ہی بنالوں گا. وقت بچ جائے گا.

تمھیں پتا ہے کہ مَیں لین دین کا ازلی کھرا ہوں. مستعار لی ہوئی چیزیں احتیاط، ذمہ داری اور خوش دلی سے جلد از جلد واپس کرنے کا عادی ہوں. حیلہ سازی نہیں، حجت بازی نہیں. جس کی ملکیت ہو، اسی کے پاس رہے. مکمل بھی رہے اور محفوظ بھی.

سنائے گئے کلام کا لٹا پٹا غیر گرم جوش رنگ و آہنگ بہت سی رسیلی سماعتیں فتراک میں باندھ لایا کرے گا اور پھولوں کی کیاریوں میں ان کی سدا بہار قلمیں لگا لے گا کہ اچھی سماعتوں کی صحت مند پنیری بھی تیار ہوتی رہے.

اگر کبھی کسی مضطرب مخلص نے حقیقی یا رسمی طور پر نئے مجموعے کی ترتیب و اشاعت کا پوچھا تو اسے سیدھا تمھاری آنکھوں کا قبۃ الکلام، بیت الشعر اور سرچشمۂ سخن ہی دکھاؤں گا کہ دیکھ لو میاں، بہت کچھ ہو چکا، ہمارا آخری امکانی مجموعۂ کلام بے اعتنائی کے چاک پر تخلیق بھی ہو رہا ہے، ساتھ ہی ساتھ مرتب صورت پذیری کے عمل سے بھی گزر رہا ہے، اس کی نشر و اشاعت کی بہترین خود کار پیش کش بھی مسلسل جاری ہے اور اسے قبل از وقت ہی بہت وسیع پیمانے پہ پسند کیے جانے کی خوش خبریاں بھی تواتر سے مل رہی ہیں. کہیں یہ خاتم المجموعہ جات کچھ نہ کچھ کاروبار ہی نہ کر بیٹھے.

اے بے تاب مخلص اور شائق دوست، فلاں لاتعلق اجنبی آنکھوں میں سے کچھ پڑھ سکتے ہو تو پڑھ دیکھو. پڑھ پاؤ تو مجھے بھی اکا دکا چیزیں سنا دو، لحن میں یا تحت میں، جیسے چاہو، کہ کبھی کبھی اپنی تخلیقات دوسروں کی زبان سے سننے میں اور ہی مزہ آتا ہے.

معین نظامی

ہر طرف گونج اٹھی صدا مسترد
دل اٹھا اور کہنے لگا مسترد

خُلقِ عظیم کی مہک حاصلِ باغِ دہر ہے
نقشِ قدم کی روشنی چشم و چراغِ دہر ہے

میری جبینِ شوق پر مُہر ہے اک لگی ہوئی
مُہر بھی وہ جو دائمی خطِّ فراغِ دہر ہے

وادیِ سبزِ بے خودی، کوئی مرا پتا تمھیں
کھوئے ہوؤں میں تیرے بھی ایک سراغِ دہر ہے

پوچھیے جان و دل کے اُس چارہ گرِ کریم سے
کس لیے میری زندگی نسخۂ داغِ دہر ہے

قطرۂ آبِ ذوق نے مجھ میں اٹھ کے یہ کہا
علم و ہنر کا زعم بھی دُردِ ایاغِ دہر ہے

بادِ صبا میں یادِ عزیزانِ دجلہ ہے
ابرِ رواں میں جلوۂ جانانِ دجلہ ہے

دل تھم نہیں رہا ہے کہیں پر بھی آج تو
طشتِ خیال میں دُرِ غلطانِ دجلہ ہے

یہ چشمِ تر ہی نسبتِ اجداد سے بچی
یہ صدقۂ فرات ہے، فیضانِ دجلہ ہے

ممکن نہیں مراد براری نہ ہو سکے
اب میرا دستِ شوق ہے، دامانِ دجلہ ہے

دل میں ہی لا کے رکھیے مقاماتِ دجلہ کو
یہ دشتِ بے کنار ہی شایانِ دجلہ ہے

کل خضر نے اشارۂ ابرو سے یوں کہا
یہ بارگاہِ حضرتِ سلطانِ دجلہ ہے

چمکا دیا ہے نیّرِ تابانِ چشت نے
ذرّے کو دل میں رکھ لیا جانانِ چشت نے

لب خندِ دل کشا سے نوازا، مہک بھی دی
دل کی گرہ کو اُس گلِ خندانِ چشت نے

دیکھا تو خاص اپنے لیے چُن لیا مجھے
اک وقتِ خاص میں شہِ ذی شانِ چشت نے

تابع کیے رکھا ہے شیاطینِ نفُس کو
کس شان سے ہمارے سلیمانِ چشت نے

دل در بہ در ہی رہتا مگر خوش نصیب تھا
اپنا بنا لیا اسے پیرانِ چشت نے

عہدِ الست بھول رہا تھا مگر مجھے
پھر یاد سب کرا دیا پیمانِ چشت نے

مَیں زر خریدِ عشق ہوں، یہ داغ دیکھیے
بولی مری لگائی تھی احسانِ چشت نے

تختِ رواں سے کم یہ چٹائی نہیں مجھے
اک بوریا مرا بھی ہے ایوانِ چشت میں

تکرارِ خواب بھی تو نشانی کرم کی ہے
دہلی بلا لیا مجھے سلطانِ چشت نے

خدا کا شکر ہے یہ استعارہ باقی ہے
ابھی زمین پہ دل کا ستارہ باقی ہے

سنائی کچھ نہیں دے گا ہمارے ہونٹوں سے
سخن تمام ہوئے ہیں، اشارہ باقی ہے

رکھا تھا ذہن میں جو کچھ بھی، کچھ نہیں باقی
بچا کھچا تھا جو دل میں، وہ سارا باقی ہے

تمھاری شکل میں سارا نہیں ملا ہے ہمیں
ہمارے حصے کا باقی خسارہ باقی ہے

کنارہ کش ہوئے دنیا سے، خود سے، خواہش سے
تمھاری سمت کا گرتا کنارہ باقی ہے

اتر گئے مرے سر سے تمام قرض مرے
بس ایک بوجھ سا دل پر تمھارا باقی ہے

ہم اک جزیرۂ منظر میں رہ رہے ہیں جہاں
نظر کہیں نہیں باقی، نظارہ باقی ہے

خاموش کیوں نہ ہوں کہ ہے اکسیر خامُشی
ہر علم و فن کی ہے یہی تفسیر، خامُشی

خاموش رہ کے بات بتانا کمال ہے
راہِ سلوک میں تو ہے توقیر خامُشی

خاموش وہ نہیں ہے جو اِبلاغ سے گیا
دراصل گفتگو کی ہے تصویر خامُشی

خاموش رہ سکوں مَیں جہاں تک بھی ہو سکے
ہو گی تو اس کی بھی کوئی تدبیر خامُشی

خاموش بن کے نام کمایا تو حیف ہے
اللہ کرے نہ باعثِ تشہیر خامُشی

خاموش ہے تخلصِ مولائے قونیہ
اب کس سے ہو گی تیری وہ تعبیر خامُشی

خاموش ہوں تو چپ مری ترجیح جانیے
لکھی نہیں ہوئی مری تقدیر خامُشی

اترا ہے دل پہ آج یہ پیغامِ تشنگی
آغازِ تشنگی ہے، نہ انجامِ تشنگی

کس برزخِ نفاق میں خیمہ مرا لگا
نَے کفرِ سیر نوشی، نہ اسلامِ تشنگی

طوفِ وداع کر لیا لیکن ہوا نہیں
ہم سے نہیں کُھلے گا یہ احرامِ تشنگی

مفتی نہیں، فقیہ نہیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ
رہتے ہیں یاد ہم کو بھی احکامِ تشنگی

جتنے بھی دور چلتے رہیں، خیر سے چلیں
ہم کو اگر ملے تو ملے جامِ تشنگی

تصریح بارِ خاطرِ رمز و کنایہ ہے
مولا، اسی طرح رہے ابہامِ تشنگی

سیرابیوں کو دور سے روشن دِکھائی دیں
گردِ دیارِ دل میں در و بامِ تشنگی

برتا ہوا ازل سے ہے میرا یہ دشت بھی
اے ریت، اے عزیزِ دل آرامِ تشنگی

کیا مَیں مریدِ سیّدِ تشنہ لباں نہیں؟
واجب ہے میرے ذوق میں اکرامِ تشنگی

پانی کے آپ نے تو معانی سنے نہیں
مفہوم ایک یہ بھی ہے: ہم نامِ تشنگی

بجھتی نہیں ہے پیاس کسی طور سے مری
جاتے نہیں ہیں ذہن سے ایامِ تشنگی

دل بھی معینؔ حافظِ ابجد ہے درد کا
رہتی ہے اس کو یاد الف لامِ تشنگی

ہر طرف گونج اٹھی صدا مسترد
دل اٹھا اور کہنے لگا مسترد

روشنی اور پانی پہ قدغن لگی
ہو گئی ہر فضا میں ہوا مسترد

باغ میں میرے مالی کے اعلان سے
طے ہوئی میری نشو و نما مسترد

جانے کیا سوچ کر آپ نے کر دیے
ایک ہلّے میں ارض و سما مسترد

سارے اہلِ خرد نے اکٹھے کیے
سارے اہلِ جنوں اے خدا مسترد

دم بہ خود رہ گئے سارے اعلانچی
شہر کے شہر نے جب کہا مسترد

فیصلہ کرنے والوں نے سوچا نہ تھا
اس طرح ہو گا یہ فیصلہ مسترد

کرنے لگے سب وکیل ٹیڑھی
دینے لگے ہر دلیل ٹیڑھی

سیدھی رہی جب تلک تھی سیدھی
اب ہو گی مرے کفیل ٹیڑھی

لازم ہے ترا علاج شافی
کرتے ہیں کوئی سبیل ٹیڑھی

ٹیڑھا تھا مرا دماغ اتنا
ٹھونکی گئی اس میں کِیل ٹیڑھی

اس عشق کو ہم کریں گے سیدھا
اس شہر کی ہے فصیل ٹیڑھی

ہونا ہی پڑا ہمی کو سیدھا
دنیا تو رہی رذیل ٹیڑھی

ہم نے اسے بار بار چاہا
لیکن یہ رہی ذلیل ٹیڑھی

چاہے گا اگر فقیر ٹیڑھی
ہو جائے گی ہر لکیر ٹیڑھی

کھودی تو نہیں تھی دل نے ایسی
نکلی ہے یہ جُوئے شیر ٹیڑھی

اس ٹیڑھ کو کہہ رہے ہو سیدھا
ٹیڑھی ہے یہ، بے ضمیر، ٹیڑھی

لگتا نہیں صلح ہو سکے گی
سوچیں ہیں تری، شریر، ٹیڑھی

کس نے تجھے یہ ہنر سکھایا
باتیں ہیں تری، سفیر، ٹیڑھی

پھر موت ہوئی نصیب ٹیڑھی
گاڑی گئی اک صلیب ٹیڑھی

رستہ بھی نہیں تھا اتنا سیدھا
منزل بھی ہوئی قریب ٹیڑھی

نکلی نہیں اس کی پھانس دل سے
کل بات ہوئی عجیب ٹیڑھی

ماپی تھی مری زمین اُس نے
نکلی تھی مری جریب ٹیڑھی

سنتا تھا مرا حبیب، الٹی
کہتا تھا مرا طبیب، ٹیڑھی

سیدھا ہی نہیں مرا ستارہ
کیوں چال چلے رقیب ٹیڑھی

آئینہ تو پہلے دیکھ آئے
پھر بات کرے غریب ٹیڑھی

ڈھول بجنے لگا ہے کہیں ڈھولچی
وجد میں ہیں زمان و زمیں ڈھولچی

ریت کا جشن روشن رہے دشت میں
اور بیٹھا رہوں مَیں وہیں ڈھولچی

میری ڈَھپری فقیروں کا ڈیرہ رہے
تم بھی رہنا ہمیشہ یہیں ڈھولچی

میرا ڈھولن جہاں ہو، وہ کیسے نہ ہو
عاشقوں کی بہشتِ بریں ڈھولچی

اس مکان و مکیں کے سوا کچھ نہیں
ڈھول ہے دل اور اس کا مکیں ڈھولچی

اپنے روتے ہوئے ساز غائب کرو
آنے والا ہے خندہ جبیں ڈھولچی

ایسی باتیں تمھیں زیب دیتی نہیں
چھوڑ جانا تو اچھا نہیں ڈھولچی

جنگ شروع ہو چکی، دیر سے آئے ایلچی
موت کے گھاٹ اتار دو اپنے پرائے ایلچی

خیمے تو لائے ہی نہ تھے محشرِ کارزار میں
دور کے ایک گاؤں میں ہم نے سُلائے ایلچی

وہ جو سرِ بُریدہ ہے، اس کو سجاؤ طشت میں
پوششِ سرخ پر لکھو تحفہ برائے ایلچی

معرکۂ مذاکرات جیت سکے گا ہم سے کون
ہم نے تو گنگ و کور و کر چن کے بنائے ایلچی

نصف زبان کٹ گئی، اس کا بھی دیکھ لیں گے ہم
نصف تو اس کے منہ میں ہے، کچھ تو بتائے ایلچی

فتح کے جشن میں ہمیں کچھ بھی نیا نہیں ملا
بانوئے شہر کا محل ہم کو دکھائے ایلچی

خواجہ سرا کا فعل بھی قابلِ در گزر نہیں
اس سے مگر قبیح تر ہے یہ خطائے ایلچی

قاضی و شیخ و محتسب مشورے پاس ہی رکھیں
ہم ہی یہ طے کریں گے کل، کیا ہے سزائے ایلچی

ایک کھنڈر سا آج بھی گاؤں کے راستے میں ہے
سارے بزرگ کہتے تھے اس کو سرائے ایلچی

گفت و شنید ہو چکی، بحث شدید ہو چکی
فوج روانہ کیجیے اب تو بہ جائے ایلچی

جب بھی حرم کے مسئلے حل ہوئے تو ملیں گے ہم
نوبتِ بار اب نہیں، خیر سے جائے ایلچی

اوٹ کے پار کون ہے خود میں مگن شکارچی
دیکھو شکار آ گیا، وہ بھی ہرن شکارچی

ایسا ہرن یہاں تو کیا، روئے زمین پر نہیں
اس کی تلاش میں رہا دشتِ ختن شکارچی

ایسا لطیف و خوش مزہ جسم کبھی ملا نہیں
جِلد پہ نام کی نہیں کوئی شکن شکارچی

سارا نہالِ یاسمن، جھومتی شاخِ نسترن
کون کہے اسے ہرن، یہ ہے چمن شکارچی

دشت سے موتی کب ملے، ہو گیا آج معجزہ
ریت میں ہم کو مل گیا دُرِ عدن شکارچی

پیٹ کی آنکھ سے اسے دیکھنا ہم پہ فرض ہے
پھانس نہ لے کہیں ہمیں اس کی چبھن شکارچی

پیشِ نظر رکھیں گے ہم پیشہ ورانہ ضابطے
بھون کے اس کو کھایئے، ہو یہ لگن شکارچی

بھانے لگا اگر ہمیں اس کا جمالِ نازنیں
پھر تو سمجھ لو آ گیا دورِ فتن شکارچی

لو، یہ سراب تھا کوئی، نقش بر آب تھا کوئی
رہ گئی میرے ہاتھ میں میری تھکن شکارچی

پھر تمھیں رونا آ گیا خندہ بہ لب طناپچی
ایک گرہ نہ لگ سکی، کیا ہوا اب طناپچی

ہاتھ بھی اور ہونٹ بھی کانپ رہے ہیں صبح سے
ہم کو یہاں کھڑے کھڑے ہو گئی شب طناپچی

دار و رسن کے تم تو تھے نسل بہ نسل پیشہ ور
بھول گئے ہو کس لیے سارے وہ ڈھب طناپچی

تم پہ تو لطفِ خاص ہے شاہ و وزیر و میر کا
تم تو ہو تخت و تاج کے میر غضب طناپچی

گردنِ خود سراں کا بھی کچھ تو کرو معالجہ
آج نہیں ہوا تو پھر ہو گا یہ کب طناب‌چی

ہوں شہِ سر برہنگاں، اپنی کلاہِ سرخ کو
مجھ سے تو دور ہی رکھو، حدِ ادب طناب‌چی

بوسۂ مرگ کے لیے دار پہ ہوں مَیں منتظر
مر گئے میرے شہر کے آج ہی سب طناب‌چی

اے جانِ قرنطینہ، جانانِ قرنطینہ
اے روحِ مسیحائی، ایمانِ قرنطینہ

اِس کلبۂ احزاں میں اِک شمع فروزاں ہے
یعنی تری چاہت ہے سامانِ قرنطینہ

دل دست و گریباں ہو کہتا ہے یہی مجھ سے
کیا مَیں ہی لگا تم کو شایانِ قرنطینہ

آنکھوں سے کہو جا کر فی الوقت یہ بہتر ہے
ہم پیشِ نظر رکھیں پیمانِ قرنطینہ

مجنوں مرے خیمے میں کل آ کے یہ کہتا تھا
اس دشت میں ہوں مَیں ہی پُرسانِ قرنطینہ

اے زلفِ پراگندہ، زنجیر کشائی کر
مجھ سے تو نہ ٹوٹے گا زندانِ قرنطینہ

واعظ نے یہاں پر بھی کیا خطبہ فروشی کی
یہ شخص بھی کیا شے ہے، نادانِ قرنطینہ

اس قحطِ تشکّر میں ہم شکر بجا لائے
نعمت ہی لگی دل کو بارانِ قرنطینہ

ہم خاص اسیروں کی ہے منتقلی ممکن
ہے کوچۂ جاناں میں امکانِ قرنطینہ

دیتا ہُوا دُہائی دلِ دردمند سے
گزرا تھا ایک شام کو مَیں بِرجند سے

دربند سے چلا تھا سمرقند کے لیے
منزل چنی تھی ویسے کسی کی پسند سے

اَن دیکھے راستے پہ چلا جس قدر چلا
دعوت اگرچہ آئی ہوئی تھی خُجند سے

ہر خیرخواہ روک رہا تھا نجانے کیوں
میرا دماغ چھِل گیا زنجیرِ پند سے

وہ کارواں تھا ایک مسافر پہ مشتمل
جو بچ نہیں سکا تھا کسی بھی گزند سے

مَیں سیستانِ رستم و سہراب میں رہا
اچھے تعلقات رہے قید و بند سے

آخر کو کام آئے طلسمات ہی مرے
وہ ہفت خواں، بنے تھے جو دودِ سپند سے

تعدیلِ خواب بھی وہی تفصیلِ خواب ہے
یہ خاص واردات بھی تعمیلِ خواب ہے

اب اور کچھ بتانے کے قابل نہیں ہوں مَیں
اک نسخہ میرے پاس تو تقلیلِ خواب ہے

ہم خواب ہیں تو خواب کی اصلاح کے لیے
شافی علاج آج بھی تبدیلِ خواب ہے

ہم خواب ہیں تو یاد بھی رکھیں کہ خواب ہیں
اس کے لیے بھی داروئے ترتیلِ خواب ہے

ہم خواب ہیں اور آپ کے تحفے کے منتظر
مطلوب آپ سے ہمیں ترسیلِ خواب ہے

یہ شکر جیسا شکوہ کہ دیوانِ خواب ہے
لگتا نہیں تمھیں کہ یہ ہذیانِ خواب ہے

تعبیر کے گلے میں مسلسل پھنسی ہوئی
ہڈی ہے کوئی یا کوئی اعلانِ خواب ہے

اب نیند کے سوا مرے کرنے کو کچھ نہیں
لُٹنے کو گھر میں بس یہی سامانِ خواب ہے

سر ہے اگر عزیز تو دل بیچ آؤں مَیں
اس سر پھرے کے ذہن میں امکانِ خواب ہے

سوچوں کی شاہ رگ پہ ہیں عفریت کے قدم
دیووں کی راج دھانی پرستانِ خواب ہے

اس کے سوا کوئی نہیں جو خواب بن سکے
وہ جانِ خواب ہی مرا جانانِ خواب ہے

سالارِ سرفروش سلامت رہے سدا
وہ شمعِ سرکشیدۂ ایوانِ خواب ہے

نورِ نگاہِ حلقۂ اصحابِ فاقہ ہے
روزہ بھی کیا صحیفۂ آدابِ فاقہ ہے

دروازے یوں تو قصرِ معارف کے کم نہیں
سب سے مگر قریب یہی بابِ فاقہ ہے

میری سنو تو بات میں پیچیدگی نہیں
تصدیقِ فقر کچھ نہیں، ایجابِ فاقہ ہے

معموریِ دروں کی بنا ہے گرسنگی
معمارِ دل کوئی ہے تو سیلابِ فاقہ ہے

اس ریگ زارِ گرمِ ریاضت میں ایک ہی
سرسبز باغ، گلشنِ شادابِ فاقہ ہے

ان پانیوں کی سمت چلے ہو تو سوچ لو
وہ زندہ رود سارا ہی گردابِ فاقہ ہے

مَیں خوش نصیب ہوں کہ مرے گھر میں آج بھی
اللہ کے کرم سے کچھ اسبابِ فاقہ ہے

ارض و سما کے سارے خزانے بھی ہیچ ہیں
کٹیا میں گر خزینۂ نایابِ فاقہ ہے

مجھ سے معینؔ بات یہ وارفتگی نے کی
دیکھ آیئے اسے کہ جو سیرابِ فاقہ ہے

صبح و شام الجھن ہے، روز و شب تردّد ہے
جو بھی کر رہے ہیں ہم سب کا سب تردّد ہے

اس کے ختم ہونے کا انتظار کرتے ہیں
اب تو ہے تردّد ہی ہم کو جب تردّد ہے

شرحِ صدر کب ہو گا کچھ بتا نہیں سکتے
ہاں مگر بتا دیں گے کتنا کب تردّد ہے

اس کی اور لذّت ہے، اجنبی سی، بھولی سی
یہ جو دل کی نیّت میں بے سبب تردّد ہے

دھوپ میں چمکتے ہیں پھول، سبزہ، مَیں اور تم
ہلکی ہلکی خنکی ہے اور عجب تردّد ہے

عارضی سفر کی یہ شاید ایک منزل ہو
جو کہا سنا ہم نے، اس میں اب تردّد ہے

مجھ کو اس کی شدّت کا کچھ نہیں تھا اندازہ
اب سمجھ میں آیا ہے کیا غضب تردّد ہے

غم و الم کی طرح کی، ہنسی خوشی جیسی
درخت میں بھی کوئی شے ہے آدمی جیسی

یہ کیا طلب ہے کہ بجھتی نہیں کسی صورت
یہ آگ کیوں ہے رواں مجھ میں تشنگی جیسی

ہے رنگ ڈھنگ مری آگہی میں غفلت کا
چمک دمک مری غفلت میں آگہی جیسی

مَیں روز و شب یہی لکھتا ہوں شرم ساری سے
عمل کے باب میں اک فصل کوتہی جیسی

مَیں شاخ و برگ سے پوچھوں کہ کیسے آتی ہے
سخن میں تازگی سرسبز زندگی جیسی

بہت کچھ ہو چکی خواری ہماری
اب اس کے بعد ہے باری ہماری

برہنہ پا کھڑی تھی ان کے در پر
کئی نسلوں سے بیزاری ہماری

اسیرِ خویشتن ہیں ہم ازل سے
دوامی ہے گرفتاری ہماری

سفر کرنا ہے دل کی حد سے باہر
ہے جاری کب سے تیاری ہماری

خدا ان کے دلوں کو شاد رکھے
جو کرتے ہیں دل آزاری ہماری

ہمارا دل بھی ہے مرضی کا مالک
نہیں کرتا طرف داری ہماری

سبھی کو پہلے بتلایا تھا ہم نے
بھروسے کی نہیں یاری ہماری

نہیں فرصت کسی کے پاس ورنہ
کہاں مشکل تھی دل داری ہماری

ہمیں ترکے سے دے دیجے قناعت
تہی دستی ہوئی ساری ہماری

جینے کو کارزار بنایا نہیں گیا
کینے کو کاروبار بنایا نہیں گیا

مشقِ منافقت نہ ہوئی ہم سے آج تک
دل مسجدِ ضرار بنایا نہیں گیا

کافی رہی ہمیشہ فصیلِ مزاج ہی
کوئی نیا حصار بنایا نہیں گیا

بے اعتبار شہر میں سب معتبر بنے
ہم سے تو اعتبار بنایا نہیں گیا

یہ دوستی بھی گھر ہی سمجھ لیجیے مرا
یہ گھر بھی بار بار بنایا نہیں گیا

ابھی تعمیر میں داخل رہوں گا
تری تخریب میں شامل رہوں گا

نظر آتا رہے گا نفع مجھ کو
تو مَیں تیری طرف مائل رہوں گا

تری منطق میں میرا فائدہ ہے
سو مَیں اس کا بہت قائل رہوں گا

مہِ کامل سمجھتا تو یہی تھا
مَیں کامل ہوں تو بس کامل رہوں گا

دماغ و دل اکٹھے ہو گئے تو
مَیں پھر بھی بیچ میں حائل رہوں گا

روایت جب تلک جاری رہے گی
مَیں اس کا شارح و ناقل رہوں گا

یہ لگتا ہے تری دہلیز کا مَیں
ہمیشہ کی طرح سائل رہوں گا

بامِ دیدار پہ تنویرِ تماشا کیا ہے
وہی جلوہ ہے کہ تصویرِ تماشا، کیا ہے

کتنی صدیوں سے گرفتار ہیں آنکھیں سب کی
اتنی صدیوں سے یہ تقدیرِ تماشا کیا ہے

جدولِ حُسن ہے زر تارِ بصارت کیسی
مِسطرِ رنگ پہ تسطیرِ تماشا کیا ہے

حجلۂ نقش میں مدہوش پڑے ہیں سارے
کون بتلائے کہ تاثیرِ تماشا کیا ہے

چشمِ حیرت زدہ خجلت سے یہ کہتی ہے مجھے
دل سے ہی پوچھیے تقصیرِ تماشا کیا ہے

دل ہی ابلاغ کا ماہر ہے، اسی سے پوچھوں
اے مرے آئنے، تفسیرِ تماشا کیا ہے

جاگتے میں تو نہیں کھلتی مناظر کی گرہ
خواب میں دیکھیے تعبیرِ تماشا کیا ہے

ایک چہرے کی تجلی نے دکھایا ہے مجھے
جلوہ کیا چیز ہے، تطہیرِ تماشا کیا ہے

اہلِ دل دید کے آداب سے بیزار ہوئے
قحطِ نظّارہ میں توقیرِ تماشا کیا ہے

کور چشموں کی محافل میں جو موضوع بنی
رہنے دیجے کہ وہ تحقیرِ تماشا کیا ہے

مرشدِ اہلِ ملامت، مجھے بیعت کر لے
مَیں بھی چکھ لوں کہ یہ تشہیرِ تماشا کیا ہے

پھر دل کی خیمہ گاہ میں اجماعِ درد ہے
کیا درد ہے کہ جوہرِ انواعِ درد ہے

مشقِ الم میں عمر گزاری تو یہ کھلا
ہر درد ہی کرشمۂ ابداعِ درد ہے

تیر و سناں کا قبلۂ اوّل کہیں جسے
وہ شہ سوار مرکزِ اَضلاعِ درد ہے

دل نے کہا ہلالِ محرم کو دیکھ کر
کس درجہ کاٹ دار یہ مصراعِ درد ہے

نورِ نگاہِ چشمِ مودّت ہے بالیقیں
یہ گریہ جو خلاصۂ اوضاعِ درد ہے

کس طرف ہے دیارِ تمباکو
جلوۂ کشت زارِ تمباکو

سبز پتوں کی وہ توانائی
وہ زرِ بے شمارِ تمباکو

خشک ہو کر عزیز تر ہونا
مختلف ہے شعارِ تمباکو

اس کی پژمردگی، شگفتن ہے
ہے خزاں ہی بہارِ تمباکو

جتنا کڑوا ہو اتنا میٹھا ہے
ہے عجب کاروبارِ تمباکو

کاشت کاروں سے پوچھ لیجیے گا
پھول لگتا ہے خارِ تمباکو

کتنا رہتا ہے ان کسانوں کو
سال بھر انتظارِ تمباکو

پان والوں سے پوچھیے، کیا ہے
عزّت و اعتبارِ تمباکو

دل جلو، ہم بھی اک زمانے میں
دل سے تھے جاں نثارِ تمباکو

اب طبیبوں کے ہاتھ سے ہم ہیں
مستقل شرمسارِ تمباکو

یاد آتی ہیں کھبڑیاں اکثر
وہ نڑی، وہ خمارِ تمباکو

وہ ہو تیجے میں دل سلگتا ہوا
وہ دھواں، وہ خمارِ تمباکو

اے اسد بیگ، میرے خطّے میں
تم ہی ہو تاج دارِ تمباکو

تم نے اکبر کے سامنے گاڑا
پرچمِ اقتدارِ تمباکو

ایشائے جنوب میں تم ہو
مایۂ افتخارِ تمباکو

اب تری مدح بھی جسارت ہے
اے مرے گل عذارِ تمباکو

نا پسندیدہ تیرا ذکر بنا
کہ نہیں روزگارِ تمباکو

اہلِ تصنیف کے یہاں بھی رہا
سال ہا کارزارِ تمباکو

تو مگر سخت جان کتنا تھا
اے جری شہ سوارِ تمباکو

عمر بھر ٹوٹ کر محبت کی
آخری سانس میں خیانت کی

آنکھوں آنکھوں میں بات کی دل نے
اور پھر بات بھی بغاوت کی

دل سے پوچھا نہیں کسی نے بھی
کہ میاں، تم نے کیوں حماقت کی

دیکھنے والے دیکھ لیں مجھ کو
جس نے بے کار میں ریاضت کی

کس نے کھودا پہاڑ دوری کا
کس نے فاقے میں یہ مشقت کی

کچھ بھی طے کر کے ہم نہیں کرتے
موج ہوتی ہے بس طبیعت کی

قابلِ قدر ایسا عابد ہے
جس کو عادت نہ ہو عبادت کی

دامن نہیں تھا صاف تو پتھر اٹھائے کیوں
جو خود نہ پاک ہو، وہ نشانہ بنائے کیوں

جو جھانکتا ہو اپنے گریبانِ ذات میں
اپنے سوا کسی کو تماشا بنائے کیوں

جو اپنے شرِّ نفس کے عبرت کدے میں ہو
وہ دوسروں کے عیب سے پردہ ہٹائے کیوں

جو اپنی ذات سے ہی نہ محفوظ رہ سکے
وہ اپنے ارد گرد کسی کو ستائے کیوں

اپنا ہی اعتبارِ گواہی نہ جس کا ہو
وہ دوسروں کا بارِ گواہی اٹھائے کیوں

دیکھ لیجے، یہاں سے ملتی ہے
دھوپ اس سائباں سے ملتی ہے

زندگی اپنی معنویت میں
کچھ نہ کچھ رائگاں سے ملتی ہے

ساری تشویش میرے حصے کی
دل کو اک مہرباں سے ملتی ہے

ہر اذیّت ہمیں تواتُر سے
اُسی دارُالاماں سے ملتی ہے

اک دریچہ تھا، وہ بھی بند ہوا
اب تسلّی کہاں سے ملتی ہے

ایک دروازہ جو کھلا نہ کبھی
ہر کشائش وہاں سے ملتی ہے

دشمنی کی نفیس جنس یہاں
کوچۂ دوستاں سے ملتی ہے

دوستی کی چٹائی کتنے میں
آج کل کس دکاں سے ملتی ہے

شکل میرے مکاں کی دیکھیے گا
ہُو بہ ہُو لامکاں سے ملتی ہے

خواب ہی میں سہی، غنیمت ہے
شہرِ اجمیر کی عنایت ہے

رَت جگے کے تو خیر کیا کہنے
نیند کی بھی کوئی فضیلت ہے

آ گیا تُو مری ہتھیلی پر
اے دیے، یہ تری محبت ہے

روشنی نے مجھے دیا لنگر
اس تبرّک میں خاص لذت ہے

ایک دہلیز نے دیا بوسہ
میرے ماتھے، تمھاری قسمت ہے

اک ستوں نے معانقہ بھی کیا
دل میں اب تک بھی اس کی راحت ہے

سایہ بنتے ہوئے نقوش سبھی
محو ہوتی ہوئی حقیقت ہے

وقت کو روک لینا چاہتا ہوں
خواب کو جانے کیسی عجلت ہے

عکس سا ایک بھول جاتا ہوا
مطمئن ہوں کہ یہ زیارت ہے

غبارِ خاطرِ احباب سے نکل آیا
میں اپنے حلقۂ آداب سے نکل آیا

بہت اداس ہوا جب وہ میری حالت پر
تو ایک رات مرے خواب سے نکل آیا

لگا تھا ڈوب گیا ہے مگر اچانک ہی
دل اُس شکنجۂ گرداب سے نکل آیا

خدا کا شکر کہ عزّت بچا کے آخر کو
میں اُس کے دفترِ اَنساب سے نکل آیا

مجھے تلاش تھی جس قُلزمِ کرشمہ کی
وہ دل کے چشمۂ پایاب سے نکل آیا

ناحق نہ کہیں سبھی ندارد
دارد ہیں کئی، کئی ندارد

تم نے بھی تو اور کچھ نہ سیکھا
ہر بات پہ ایک ہی ندارد

دنیا کا اداریہ تو دیکھو
ابواب میں دل کشی ندارد

پتھر سے نکال لایا پانی
اب دل ہے کہ تشنگی ندارد

اس نظم میں کیا ہے جو نہیں ہے
بس یہ ہے کہ شاعری ندارد

تقریب میں کیا شریک ہونا
ہیجان ہے، سرخوشی ندارد

بے فیض ہوئے علوم سارے
سب کچھ ہے بس آگہی ندارد

خرمُہرۂ انا مری زنبیل میں نہیں
نخوت کا نون بھی مری انجیل میں نہیں

عجلت میں کوئی رنگِ اذیت نہیں جما
دھیرج میں جو مزہ ہے، وہ تعجیل میں نہیں

بے خوف ہاتھیوں کو خبر ہے کہ ان دنوں
کنکر کسی بھی فوجِ ابابیل میں نہیں

کیا جانیے کہ کیسے قیامت بپا ہوئی
جنبش ذرا بھی صُورِ سَرافیل میں نہیں

سب خیمہ زن ہمارے دلوں میں ازل سے ہیں
لشکر کوئی بھی ملکِ عزازیل میں نہیں

ساتھ جائے گا نہیں اندک و بسیارِ زمیں
ہم دلِ زار پہ کاہے کو رکھیں بارِ زمیں

کیا بتاؤں مَیں تمھیں اے مرے دل دارِ زمیں
مَیں سرِ عرش ہوا کیسے گرفتارِ زمیں

مَیں زمیں زاد ہوں توہینِ زمیں کا وارث
تا قیامت ہی رہوں گا مَیں عزادارِ زمیں

کوئی مردہ نہیں دیکھا ہے ابھی تک مَیں نے
اپنے حصے سے زیادہ کا طلب گارِ زمیں

کوئی زندہ نہیں دیکھا ہے ابھی تک مَیں نے
جس کو ہو حد سے زیادہ نہ سروکارِ زمیں

قطعاً نہیں یہ ذوقِ زبانی کے طور پر
ہر گز نہیں یہ شوقِ بیانی کے طور پر

یہ محض لفظ بھی ہیں تو از راہِ التفات
سنیے گا ان کو جانِ معانی کے طور پر

پودے بھی بولتے ہیں، مجھے علم ہی نہ تھا
ویسے سنا ہوا تھا کہانی کے طور پر

مَیں سارے پھول توڑ چکا تو بہ گوشِ ہوش
دل نے سنا پیامِ نہانی کے طور پر

''مجھ کو بھی کچھ یقین رہے موتیا ہوں مَیں
دو پھول رہنے دیتے نشانی کے طور پر''

دل کو امیدِ وعدۂ وعدہ خلافی ہے
ویسے تو اِس عزیز کو اتنا بھی کافی ہے

حاضر نہیں ہوا ہوں، دعا گو تو دل سے ہوں
یہ بھی نہ آنے جانے کی اچھی تلافی ہے

اے دردِ بے اماں، ترے ہاتھوں سے رات بھر
دل کی زبانِ خشک پہ اللہُ شافی ہے

ہونٹوں پہ آئی بات نہیں روکتا ہوں مَیں
یہ جرم ہے تو اس کی بھی کوئی معافی ہے

بافندگی ہنر ہے مگر شاعری نہیں
یہ شعر تو نہیں ہیں مگر شعر بافی ہے

میرے عالم پناہ کیا کہیے
میرے میرِ سپاہ کیا کہیے

کسی بد خواہ کی نظر نہ لگے
اس قدر عزّ و جاہ کیا کہیے

سر پھرے لوگ جی رہے ہیں ابھی
آپ ہیں بادشاہ کیا کہیے

پگڑیاں چند کیوں سلامت ہیں
اے مرے کج کلاہ کیا کہیے

کی ہے ناپاک چند کیڑوں نے
آپ کی بارگاہ کیا کہیے

ان رذیلوں کے سر کچل دیجے
ان کو دیں گے پناہ کیا کہیے

ہم غلط مشورہ نہیں دیں گے
ہم تو ہیں خیر خواہ کیا کہیے

(۲)

سر کچلنے کا شوق ہے جن کو
بن گئے سربراہ کیا کہیے

ان کے دامن پہ کوئی چھینٹ نہیں
آپ ہیں بے گناہ کیا کہیے

آپ کب ہم کو قتل کرتے ہیں
ہو گیا اشتباہ کیا کہیے

خیر سے آپ خود ہی منصف ہیں
خود بنے ہیں گواہ کیا کہیے

ایسے ایوانِ خود فروشی میں
اپنا حالِ تباہ کیا کہیے

رہ سکے ہم سے کب تلک جاری
عاجزانہ نباہ کیا کہیے

چشم و سر میں کہیں نہ پڑ جائیں
ہم کہ ہیں خاکِ راہ کیا کہیے

شکرِ خدا کہ مطلعِ انوارِ ہیچ ہے
دل کا خمیر اندک و بسیارِ ہیچ ہے

اب اس سے بڑھ کے اور ہمیں چاہیے بھی کیا
گنجینۂ دماغ بھی سرشارِ ہیچ ہے

مَیں گل فروشِ نفیِ تعلّق ہوں، میرے ہاں
باغیچۂ خیال بھی گلزارِ ہیچ ہے

جو سامنے نہیں تھے، نہ ہوں گے تمام عمر
جو سامنے ہے دفترِ تکرارِ ہیچ ہے

بے کار ہم نہیں تھے، نہ ہوں گے تمام عمر
رکھا ہوا ہمارے لیے کارِ ہیچ ہے

گٹھڑی کھلی تو بوجھ زیادہ لگا مجھے
جو مَیں اٹھا کے لایا ہوں، وہ بارِ ہیچ ہے

ہے پیچ پیچ دامِ گواہی بچھا ہوا
پکڑا گیا وہی جو گنہ گارِ ہیچ ہے

ہم کیا سکھائیں گے کہ پٹاری میں کچھ نہیں
ہاں ایک صدری نسخۂ اسرارِ ہیچ ہے

جاتے ہوئے کے بارے میں پوچھے گا کون کیوں
پوچھے کوئی تو کہیے کہ سالارِ ہیچ ہے

بیاضِ گم شدگاں میں وَرق لگا لیجے
جگہ رہی نہیں سرکار، کچھ بڑھا لیجے

ملے تو لیجیے انصاف کا بھی کچھ قرضہ
سفینہ ڈوب رہا ہے، اسے بچا لیجے

خدا کے خوف کی اک قسط کاش آ جاتی
جو ہو سکے تو کہیں سے اسے منگا لیجے

حضور آپ کو زحمت نہ دیں تو کس سے کہیں
بچا کھچا یہ خزانہ بھی آپ کھا لیجے

نجانے کون سی ٹکسال نے جَنا ہے انھیں
یہ اعتماد کے سکّے بھی سب چرا لیجے

اگر یہ طے ہے کہ تاریخ شائع ہونی ہے
تو پھر مسوّدہ ہم کو ذرا دکھا لیجے

مَیں اس غزل میں بھلا کیوں یہ قافیہ چھوڑوں
سو کہنے دیجیے مجھ کو کہ ہاں اٹھا لیجے

پہلے تو اس نے باپ کی تلوار بیچ دی
پھر اپنی سبز ریشمی دستار بیچ دی

اَجداد کی بچی کھچی عزت بھی بوجھ تھی
ملتے ہی اس نے پہلا خریدار بیچ دی

ترکے میں ملنے والی وہ زنبیلِ ذوق بھی
نیلام گھر میں بر سرِ بازار بیچ دی

دیوار ایک رہ گئی تھی، وہ بھی مشترک
دل نے وہ آدھی آخری دیوار بیچ دی

آنکھوں نے سوچ کر کبھی سودا نہیں کیا
جھونگے میں آئی دولتِ بیدار بیچ دی

اکلوتی ستر پوش تھی، جیسی بھی خیر تھی
بانکے نے موج میں وہی شلوار بیچ دی

پھر غنچۂ ہجر کھِل گیا ہے
پھر وصل کا چاک سِل گیا ہے

اب چھوڑ یہ خرقۂ حضوری
احرامِ وِداع مِل گیا ہے

وہ زخم، وہ جانِ جاں ہمارا
اک پھول تھا اور چھِل گیا ہے

کل پوچھ رہی تھیں میری آنکھیں
کس سمت ہمارا دِل گیا ہے

جس ہاتھ میں ہے مری ترازو
لگتا ہے وہ ہاتھ ہِل گیا ہے

درد پر آج رت جگا نہ کیا
دل نے اچھا یہ فیصلہ نہ کیا

دھاندلی سہتے رہنا سیکھ گئے
ہم نے کوئی مقدمہ نہ کیا

ایک تاریخ کیوں نہ یہ لکھیں
کس نے، کب، کس سے مشورہ نہ کیا

اس جری پر بھی کچھ لکھیں، جس نے
بات کرنے کا حوصلہ نہ کیا

ہم نے ہر سطح پر یہی بھُگتا
ایک تم ہی نے یہ نیا نہ کیا

جو ہو سکے تو دعاؤں کے کوئی دام نہ لے
جو ہو سکے تو کبھی ماسوا سے کام نہ لے

جو ہو سکے تو مکرر کوئی فریب نہ کھا
جو ہو سکے تو دوبارہ کوئی پیام نہ لے

جو ہو سکے تو وہی مشقِ چشم پوشی کر
جو ہو سکے تو کسی سے بھی انتقام نہ لے

جو ہو سکے تو یہ تہمت بھی طاقِ صبر میں رکھ
جو ہو سکے تو کسی شخص کا بھی نام نہ لے

جو ہو سکے تو علائق سے دل کو خالی کر
جو ہو سکے تو کبھی خود سے بھی سلام نہ لے

جو ہو سکے تو تھکن سر پہ رکھ کے چلتا جا
جو ہو سکے تو کبھی لذتِ قیام نہ لے

جو ہو سکے تو گرسنہ ہی سوئے منزل چل
جو ہو سکے تو کوئی دعوتِ طعام نہ لے

جو ہو سکے تو وہیں رہ، جہاں پہ دن گزرا
جو ہو سکے تو اجازت بہ وقتِ شام نہ لے

جو ہو سکے تو کسی در پہ خاص بن کے نہ جا
جو ہو سکے تو کسی سے بھی فیضِ عام نہ لے

جو ہو سکے تو مجاور نہ بن، مرید ہی رہ
جو ہو سکے تو وراثت میں یہ نظام نہ لے

ترجمہ ہے کہ ترجمانی ہے
دیکھیے کس قدر روانی ہے

ترجمہ دل نے کب شروع کیا
یہ کہانی بہت پرانی ہے

ترجمہ ہے بہت عزیز مجھے
کہ مری یادِ نوجوانی ہے

ترجمہ مشغلہ نہیں میرا
یہ مری مشقِ شادمانی ہے

ترجمہ تو کیا مگر نہ ہوا
یہ بھی اک رنجِ رائگانی ہے

ترجمہ ہو تو بس مسلسل ہو
یہ بھی بازارِ قصہ خوانی ہے

ترجمہ خود کو کر کے دیکھیں گے
یہ معمّا بھی داستانی ہے

ترجمہ آپ جس کو کہتے ہیں
متن کے ساتھ چھیڑ خانی ہے

ترجمہ کار سب زمینی ہیں
متن جتنا ہے، آسمانی ہے

ترجمہ طُورِ مدعا پہ کبھی
خندۂ حکمِ لن ترانی ہے

ترجمہ نقلِ لفظ ہوتا ہے
یا معانی کی ہم زبانی ہے؟

ترجمہ باز آفرینی ہے
یا کوئی اور راج دھانی ہے؟

ترجمہ دو ثقافتوں کا ملن
یا نرا ربطِ دو زبانی ہے؟

ترجمہ رسم ہے غلامی کی
یا خود اُسلوبِ حکم رانی ہے؟

ترجمہ مجتہد بھی ہوتا ہے
یا فقط مثلہٗ بیانی ہے؟

ترجمہ شوق کا مرقع ہے
یا کہ بیگار کی نشانی ہے؟

ترجمہ آپ سے نہیں ہو گا
یوں سمجھ لیجے بد گمانی ہے

نقشے کا مسئلہ ہے یہ معمار کا نہیں
بنیاد کا فساد ہے، دیوار کا نہیں

سارا فتور ہے یہ جنونِ خرید کا
کوئی کمال گرمیِ بازار کا نہیں

اچھا ہوا کہ خیر سے خاکہ بھی بن گیا
اچھا ہوا کہ یہ کسی شہکار کا نہیں

لاہور میں کشش تھی مگر اب نہیں رہی
اب تو یہ شہر میرے طرح دار کا نہیں

پگڑی نے احتجاج کیا میرے کان میں
یہ ڈھنگ تو فقیر کی دستار کا نہیں

ناحق اسے جھکانے کی کوشش نہ کیجیے
یہ میرا سر ہے، یہ کسی سردار کا نہیں

اس کا منافع اور خسارہ ہے مختلف
دل کا حساب درہم و دینار کا نہیں

سرگرمِ زندگی ہوں بڑے زور سے مگر
کچھ بھی تعاون اس میں دلِ زار کا نہیں

چاروں طرف سے گھِر کے نتیجے پہ آ گئے
تسلیم کا مقام ہے، تکرار کا نہیں

اُس شخص کو بتا ہی نہ آؤں کہ اُس کا حسن
آنکھوں کا مشغلہ ہے دلِ زار کا نہیں

حیرت نہیں کہ کوئی غذا بھی نہیں گئی
ویرانیوں میں آج صبا بھی نہیں گئی

افسوس یہ نہیں کہ دوائیں نہ جا سکیں
افسوس تو یہ ہے کہ دعا بھی نہیں گئی

آلودگی نے ایسا کیا ہے مقاطعہ
آبادیوں میں تازہ ہوا بھی نہیں گئی

دل میں چٹائیاں کئی خالی پڑی رہیں
جلسے میں اتنی خلقِ خدا بھی نہیں گئی

ہم نے مبالغے پہ رکھا ہے معاملہ
اس معرکے میں ساتھ وفا بھی نہیں گئی

آنکھوں کو کیوں نہ لے چلیں اس شہرِ پاک میں
جس سمت آج تک تو وبا بھی نہیں گئی

سب کی پگڑی اچھالیے صاحب
سارا غصہ نکالیے صاحب

شہر سنسان ہوتا جاتا ہے
کتنے بندے اُٹھا لیے صاحب

اب ہمارے بھی شعر سنیے گا
آپ نے تو سنا لیے صاحب

بدمعاش آپ کا دھڑا ہی نہیں
ہم نے بھی کچھ ملا لیے صاحب

سب سے پہلے تو آپ یہ کیجے
اپنے گھر کو کھنگالیے صاحب

ادھورا رہ گیا مجنوں سے استفادہ مرا
سو پھر سے دشت کو جانے کا ہے ارادہ مرا

نگاہِ شیخ، تری حاضری کو چل نکلوں
ہوائے توبہ سُکھائے اگر لبادہ مرا

ضرورتوں کی کفالت اُسی کے ذمے ہے
جسے خیال ہے مجھ سے کہیں زیادہ مرا

عجیب شاخ تھی صندل کی، مجھ سے کہتی تھی
بہ طورِ سرمہ لگایا کرو برادہ مرا

ترے نثار، ترے لطفِ خاص کے قرباں
کہ تیرے ہاتھ نے رکھا ہے دل کشادہ مرا

اک دریچہ تہِ دیوار نکالا اُس نے
راستہ ایک پُر اسرار نکالا اُس نے

رات اُس جانِ کرامات پہ کیا طاری تھا
راکھ سے شعلۂ دیدار نکالا اُس نے

رنگ ریزوں کا وہ مرشد ہے سو کل مٹکے سے
دل کو اک رنگ میں سرشار نکالا اُس نے

اَدھ جلا اُس نے نکالا تھا مجھے بھٹی سے
مَیں سمجھتا تھا کہ بے کار نکالا اُس نے

جس کا مذکور کہانی میں کہیں تھا ہی نہیں
کل کہانی سے وہ کردار نکالا اُس نے

آج پھر لگتا ہے شب خون کی تیاری ہے
آج پھر قافلہ سالار نکالا اُس نے

آخری تخت نشینی کی سجاوٹ کے لیے
چن کے اک آخری غدار نکالا اُس نے

رات دن مستعدِ خاص ہوں مَیں شر کے لیے
کیا یہی کچھ ہی مقدر ہے اِس احقر کے لیے

اس کے بدلے میں تو ہم راکھ بھی دینے کے نہیں
لوگ اکسیر لُٹا لائے ہیں اس زر کے لیے

اس میں بھی کتنی ہی مِسلیں ہیں پرانی رکھی
کوئی آتش زدگی راکھ کے دفتر کے لیے

آج تو دل کی تہی دستی کا عالم ہے کچھ اور
خود کو بھی لے کے نہیں آ سکے ہم گھر کے لیے

سر برہنہ ہی رہیں ہم کہ نہ بارِ سر ہو
کوئی دستار بھی درکار نہیں سر کے لیے

دل ترے لامکان میں روشن
دھوپ ہے سائبان میں روشن

جھیل قطرے میں جھلملاتی ہوئی
اک زمین آسمان میں روشن

زرد پتے دکھائی دیتے ہیں
اک حنائی جہان میں روشن

رابطے کے دھوئیں نے رکھا ہے
فاصلہ درمیان میں روشن

ہو گئے جاں بہ لب ستارے بھی
دستِ صاحب قِران میں روشن

معنی ہیں صریح، لفظ مبہم
ہے کون صراحتوں کا محرم

اِک نقطہ ہے ذو فنون ایسا
ہیں جس میں سبھی علوم مُدغَم

جس نام کا چاہیں ورد رکھیں
ہر نام ہے اس کا اسمِ اعظم

آیت ہیں وہ خاتَمِ نبوّت
قرآن میں سب سے بڑھ کے محکم

اُس پیکرِ نور کی گواہی
خود آب و گِلِ وجودِ آدم

ہے کوئی عطا قلندروں کی
ایسے ہی نہیں ہیں یہ شاد و خرّم

امیدِ شفاعتِ نبی سے
لگتا رہے نعرۂ دما دم

ہم زخمِ وجود ہیں تو ہم پر
رکھیں گے وہ خود عدم کا مرہم

ہے تحیّر زدہ اس شہر میں خاموشی بھی
کہ سنائی نہیں دیتی کوئی سرگوشی بھی

دل گرفتارِ تذبذب ہے کدھر کو جائے
گھر بھی یاد آتا ہے اور دشتِ فراموشی بھی

یہ حقیقت ہے کہ بے مثل ہے خود اس کی طرح
اس خوش اندام کی خوش باشی و خوش پوشی بھی

ایک دیوار سے مل جاتا ہے سایہ بھی ہمیں
اور چاہیں تو کچھ احساسِ ہم آغوشی بھی

مصلحت ہو گی کوئی پیشِ نظر، دھیان رہے
اتنی سادہ تو نہیں شیخ کی مدہوشی بھی

دل میں یادِ خدا بھی آتی ہے
خواہشِ ماسوا بھی آتی ہے

اس تضادات کے جزیرے پر
حبس ہے اور ہوا بھی آتی ہے

روشنی بھی ہے اس اندھیرے میں
خامشی ہے، صدا بھی آتی ہے

خواہشوں سے اُدھر کی خواہش میں
ہمیں دل سے حیا بھی آتی ہے

کل دعا نے یہ مجھ سے پوچھا تھا
کیا تمھیں بد دعا بھی آتی ہے

کچھ رنگ مری نظر نے دیکھے
باقی مری چشمِ تر نے دیکھے

نعلین کے نقش کی قسم ہے
ایسے کئی تاج سر نے دیکھے

کچھ جال شعاعوں کے خلا میں
کل رات کو بال و پر نے دیکھے

جو رہتے رہے مسافرانہ
مالک بھی کچھ ایسے گھر نے دیکھے

تعبیر ہماری ذمہ داری
اور خواب ابوالبشر نے دیکھے

یہ سرگذشت مری ہے، بیاں مخالف ہے
جو لکھ رہا ہے مری داستاں، مخالف ہے

یہاں پہ دھوپ کو حاجت نہیں ہے سازش کی
یہاں تو سائے کا خود سائباں مخالف ہے

مَیں اس کے دل میں تو ہوں، زندگی سے خارج ہوں
مکین ہے مرے حق میں، مکاں مخالف ہے

بہت دنوں میں بنا تھا جو مہرباں میرا
بہت دنوں سے وہی مہرباں مخالف ہے

اب اس کو دوسری جانب سے جا کے دیکھیں گے
زمیں کے رخ سے تو یہ آسماں مخالف ہے

کبھی ہَوا سے گلہ اور پانیوں سے کبھی
خبر نہیں تھی کہ خود بادباں مخالف ہے

اے خانقہِ نظام و خسرو
پھر سے ہے لگی ہوئی تری لَو

دہلیزِ عزیز چومنے کو
کرتا ہے ہمیشہ دل تگ و دو

لگتے ہیں یہ مہر و ماہ و انجم
دہلی کے چراغ ہی کا پرتو

جتنی بھی ہیں کہکشائیں ساری
ہیں تیرے نقوشِ پا کی پیرو

یہ خرقۂ عشق بھی عجب ہے
جس میں نہیں کوئی کہنہ و نَو

راہزن سارے راہبر نکلے
اب دلِ زار، کیا مَفر نکلے

سیپیاں ساری بانجھ نکلی ہیں
کس صدف سے کوئی گُہر نکلے

اندھے بونوں میں کیا ملے کوئی
جو قد آور ہو، دیدہ ور نکلے

مَیں ندامت سے محوِ حیرت ہوں
شیخ کم ظرف کس قدر نکلے

کسی مَسند نے قد بڑھایا نہیں
پستہ قامت تھے، مختصر نکلے

اہلِ سازش سے جا کہے کوئی
جاں بہ کف لوگ بے خطر نکلے

جب بھی میزان رکھی جائے گی
کیا خبر کون معتبر نکلے

چُھوا بھی دیں گے خیر سے، دلدارِ آئنہ
بنوائی تیرے ماپ کی دیوارِ آئنہ

اس کو نظر تو آیئے، بس اک نظر سہی
حد سے زیادہ ہو گیا اصرارِ آئنہ

ان خد و خال میں کوئی تکرار بھی نہیں
پھر یہ کدھر سے آ گیا تکرارِ آئنہ

وہ ڈھونڈتا رہا مجھے تصویرِ خواب میں
مَیں جاں بلب پڑا تھا اساطیرِ خواب میں

اے رہ گزارِ چشم و مژہ، تیری گرد میں
نکلے تھے گھر سے خواہشِ تسخیرِ خواب میں

رنگ اڑ گیا صحیفۂ رؤیا کے متن کا
اب لیں پناہ خیمۂ تفسیرِ خواب میں

وہ روحِ تشنگی ہے دل و جانِ ریگ ہے
وہ سائبانِ دشت ہے، جانانِ ریگ ہے

سر کا اُسی کے در سے ہُوا ہے معاہدہ
دل کا اُسی کے پاؤں سے پیمانِ ریگ ہے

دل کو بھی اس کے دشت کا ٹکڑا ملا معینؔ
سر میں بھی شکر ہے، وہی سامانِ ریگ ہے

فرد فرد

خوشبو سے خمیر اس کا اٹھا
وہ پیکرِ آب و گل ندارد

وہ صبح نما بیاضِ سینہ
آئینہ ہے اور دل ندارد

چہرہ تو بہت ہے ملتا جلتا
ٹھوڑی پہ مگر وہ تل ندارد

ناداریِ دل کا کیا بتائیں
دل بر کوئی مستقل ندارد

دل ایک ضمیرِ منفعل ہے
جو مرجعِ متّصل ندارد

....

بازارِ نمود میں ہماری
دکّانِ ریا چلی نہیں ہے

گیلی تھی ہمارے دل کی لکڑی
سلگی تو سہی، جلی نہیں ہے

لاہور نہیں، کچھ اور ہے یہ
پھولوں کی یہاں گلی نہیں ہے

بے ذائقہ ہے ابھی اداسی
یہ ٹہنی ابھی پھلی نہیں ہے

پرہیز کا علم تھا سو مچھلی
بھونی گئی ہے، تلی نہیں ہے

....

سارا خراب ہو گیا جملے کا ذائقہ
ایسا کریں کہ آپ ''اگر'' کو نکال دیں

جس گھر سے آپ نکلے تھے دل کو لیے ہوئے
بہتر ہے دل سے اب اسی گھر کو نکال دیں

سر سے اگر خیال نکلنا محال ہے
پھر یوں کریں خیال سے سر کو نکال دیں

....

مَیں کل جلدی سے کھل کر ہنس پڑا تھا
اداسی کے جھلک جانے سے پہلے

پرندو، آؤ، پی لو میرا پانی
کناروں سے چھلک جانے سے پہلے

وہ مسجد میں نوافل پڑھ رہا تھا
مرے حجرے تلک جانے سے پہلے

....

اس گھر میں تا بہ حدِ نظر موجِ خاک ہے
یہ خاک داں بھی معجزۂ اوجِ خاک ہے
یہ آخری دیا بھی ہوائیں بجھا نہ دیں
کیا روح بھی بدن کی طرح زوجِ خاک ہے

....

رنگین سروَرَق ہے بیاضِ ملال کا
پہلا مہینہ سرخ ہے ہجرت کے سال کا
جس کا ہر ایک پھول بہاروں کی جان ہے
اک دشت ہے عراق میں ایسا کمال کا

....

مجھ سا نصیب اور کسی کو کہاں ملا
پَرتو نہیں ملے ہیں مجھے، آسماں ملا
سچ پوچھیے تو ہم کسی قابل کبھی نہ تھے
جو کچھ ملا ہمیں تو یہاں رائگاں ملا

....

قصہ گو پھر سے مصیبت میں نظر آتا ہے
پھر وہی موڑ حکایت میں نظر آتا ہے
وہ جو ملتا ہی نہیں کون و مکاں میں مجھ کو
چشمِ آئینہ کو حیرت میں نظر آتا ہے

....

خرد کی بزم میں جا کر جنوں وکیل کریں
فقیر جو بھی کریں کام بے دلیل کریں
یہ منصفانہ ادائیں سکھائی جاتی نہیں
یہ تربیت نہیں ملتی کسے ذلیل کریں

....

بنتے گئے ہوائے ہوس کا ہدف چراغ
جتنے بھی جل رہے تھے یہاں صف بہ صف چراغ
اے بامِ خود سری، تری زینت ہمی سے تھی
آتے تو ہوں گے یاد تجھے سر بہ کف چراغ

....

حُدودِ اربعۂ آلام سے نکل جاؤں
خدا کرے کہ مَیں آرام سے نکل جاؤں

....

جو تہِ دل سے مرے دل میں بنائی گئی تھی
وہ حویلی مری رگ رگ میں جلائی گئی تھی

....

عمرِ عزیز خیر کی تلقین میں کٹی
یعنی خود اپنے نفس کی تسکین میں کٹی
توہینِ دیگراں میں کٹی آدھی زندگی
اور باقی آدھی اپنی ہی توہین میں کٹی

....

یزیدِ زندہ کی پہچان بھی ضروری ہے
حُسینیت سے یہ پیمان بھی ضروری ہے
یہاں مذمتِ ظلم و ستم نہیں کافی
زبانِ حال سے اعلان بھی ضروری ہے

....

ہمارے شش جہت جتنے بھی ہیں سارے اکٹھے ہیں
کہیں پٹھے کے الو ہیں، کہیں الو کے پٹھے ہیں
ہماری خود کفالت کی خبر شائع نہ ہو جائے
ہمارے پاس سوکھی گھاس کے گٹھوں کے گٹھے ہیں

....

جذبے کو محض رسم بنانا محال ہے
ہم نے اسے بھی خیر سے ممکن بنا دیا
تجدیدِ عہد عزم تھا، نیت تھی، کام تھا
ہم نے اسے بھی بات بنا کر دکھا دیا

....

تاریخ کہہ رہی ہے کہ زندہ ہے آج تک
کوفے میں جا کے حلف اٹھانے کی رسم بھی

....

اردو غزل میں جیسے کہ سودا و میر ہیں
ویسے ہی مرثیے میں انیس و دبیر ہیں

....

تم آ گئے تو حبس کا احساس بڑھ گیا
اس حال میں تو مجھ کو ضرورت ہَوا کی تھی
ہم پر تو کھل نہیں سکا ماتھے کا قفل بھی
کیا یہ گرہ بھی آپ کے بندِ قبا کی تھی

....

میری کشاد ہی مرے دیوار و در میں ہے
آرام ہر طرح کا مجھے میرے گھر میں ہے
پرواز کا اسیر ہوں، میری رہائی کیا
میرا قفس پھڑکتے ہوئے بال و پر میں ہے

....

نیا تو کچھ بھی نہیں تھا سو میں تو لوٹ آیا
یہی مکاں تھا مرے لامکان سے آگے
وہاں بھی لوگ یہی تھے، وہاں بھی روگ یہی
یہی زمیں تھی مرے آسمان سے آگے

....

زاہد کو خراب بھی نہ کرتے
ہم کارِ ثواب بھی نہ کرتے
معتوبِ زمانہ تھے ازل سے
اتنا سا عتاب بھی نہ کرتے

....

برہم تھے کل اک عزیز مجھ پر:
تُو ہم سے کہاں سے مختلف ہے
مَیں سینے پہ ہاتھ رکھ کے بولا:
ناچیز یہاں سے مختلف ہے

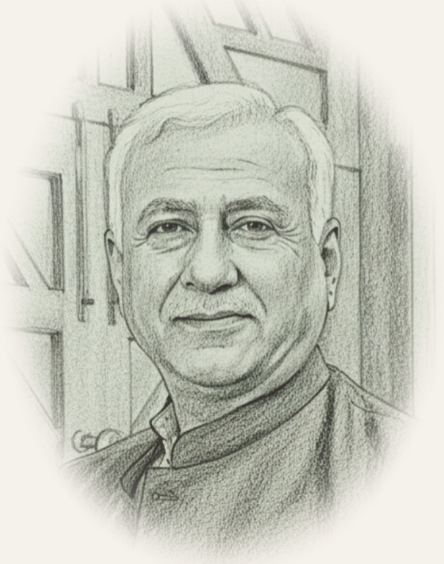
....

تدبیر کے تیشہ کار آئے
بنیادِ عناد بن رہی ہے
منشورِ مفاد لکھ رہا ہوں
فہرستِ فساد بن رہی ہے

....

سب کراماتِ سجدہ لکھی ہیں
کیا عنایاتِ سجدہ لکھی ہیں
ایسا لگتا ہے ان کے چہرے پر
ساری آیاتِ سجدہ لکھی ہیں

....



جاگتے میں تو نہیں کھُلتی مناظر کی گرہ
خواب میں دیکھیے، تعبیرِ تماشا کیا ہے

ایک چہرے کی تجلّی نے دِکھایا ہے مجھے
جلوہ کیا چیز ہے، تطہیرِ تماشا کیا ہے

مخدوم ملا میر جان لائبریری نزالی